سبق : 9

تعلیم القرآن

آن لائن اکیڈمی

(سورۃ یوسف ،آیت 80 تا 92)

فَلَمَّا اسۡتَيۡـَٔسُوۡا مِنۡهُ

خَلَصُوۡا نَجِيًّا‌ؕ قَالَ كَبِيۡرُهُمۡ اَلَمۡ تَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اَبَاكُمۡ قَدۡ اَخَذَ عَلَيۡكُمۡ مَّوۡثِقًا مِّنَ اللّٰهِ

پھر جب وہ اس سے مایوس ہو گئے تو

علیحدہ ہو کر مشورہ کرنے لگے، ان کے بڑے نے کہا کیا تم نہیں جانتے کہ تمھارے باپ نے تم سے اللہ کا پختہ عہد لیا ہے

آیت 80 ﴿ فَلَمَّا اسۡتَيۡـَٔسُوۡا مِنۡهُ خَلَصُوۡا نَجِيًّا .... : برادرانِ یوسف پہلے تو اس بات پر زور دیتے رہے کہ ہم نے باپ سے پکا وعدہ کیا ہے، وہ چھوٹے بھائی کو بھیج نہیں رہے تھے، ہم قسمیں اٹھا کر اسے ساتھ لائے ہیں۔ اگر یہ واپس نہ گیا تو بہت مشکل پیش آئے گی لیکن جب یوسف علیہ السلام نے صاف کہہ دیا کہ ہم کسی اور کو نہیں اسی کو اپنے ساتھ رکھیں گے، تو وہ مایوس اور ناامید ہو کر باہم مشورہ کرنے لگے۔ ان کے ذہن میں تھا کہ باپ کو بتانے کے لیے اب کوئی اور نئی کہانی

وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْۤ اَبِيْۤ اَوْ يَحْكُمَ
اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝۸۰ اِرْجِعُوْۤا اِلٰۤى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ

اور اس سے پہلے تم یوسف کے معاملے میں بھی زیادتی کر چکے ہو، پس میں تو اس جگہ سے ہرگز نہیں جاؤں گا جب تک میرا باپ مجھے اجازت نہ دے، یا اللہ میرے لیے فیصلہ کر دے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے (80) تم اپنے باپ کے پاس واپس جاؤ، تو کہو کہ اے ہمارے ابا جان! بے شک آپ کے بیٹے نے چوری کی اور ہم نے اسی کی

گھڑ لی جائے، تاہم ان میں سے جو سب سے بڑا تھا وہ کہنے لگا: ﴿ اَلَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ ﴾ تمھیں یاد نہیں ہے کہ تم باپ کے سامنے قسمیں اٹھا کر پختہ وعدہ کر کے آئے ہو کہ چھوٹے بھائی کو واپس ساتھ لے کر آئیں گے، اب تم اس کے بغیر باپ کا سامنا کس منہ سے کرو گے اور پھر ”مِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ“ ”اس سے پہلے تم یوسف کے معاملے میں بھی زیادتی کر چکے ہو۔“ لہٰذا اب باپ تمھاری بات ماننے کے لیے کسی صورت تیار نہیں ہو گا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کہتا ہے: ﴿ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْۤ اَبِيْۤ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴾ میں تو اس جگہ سے ہرگز نہیں جاؤں گا جب تک میرا باپ مجھے اجازت نہ دے، یا اللہ میرے بارے میں کوئی فیصلہ کرے، یعنی بھائی کی رہائی کی کوئی صورت نکل آئے یا باپ خود مجھے بلا لے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

بڑا بیٹا جس نے یہ بات کی وہ ان میں سے سب سے زیادہ سمجھدار تھا اور اسے کچھ خدا خوفی بھی تھی۔ اسی نے مشورہ دیا تھا کہ یوسف کو قتل نہ کرو بلکہ اسے کنویں میں ڈال دو۔ اب پھر وہی کہہ رہا ہے کہ باپ کے ذہن میں تو پہلے سے ہی یوسف والا سارا معاملہ موجود ہے۔ تم جاؤ اور اسے جا کر ساری صورتِ حال بتاؤ، مجھے اگر باپ نے بلانا ہوا اور باپ کے دل میں خیال آ گیا کہ وہ پردیس میں موجود ہے، لہٰذا اسے بلا لو تو پھر میں آ جاؤں گا ورنہ میں یہیں رہ کر بادشاہ کی منت سماجت کروں گا، شاید اسے ترس آ جائے اور وہ چھوٹے بھائی کو ساتھ بھیج دے، اس کے بغیر میں باپ کا سامنا کیسے کروں گا۔ اس آیت میں ”يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ“ (اللہ میرے لیے کوئی فیصلہ کر دے) سے مراد یہی ہے کہ رب تعالیٰ بادشاہ کے دل میں رحم ڈال دے اور وہ چھوٹے بھائی کو ساتھ بھیجنے کے لیے تیار ہو جائے، یا باپ خود مجھے بلا لے گویا بڑے بیٹے نے ان دو صورتوں کے علاوہ واپس جانے سے صاف انکار کر دیا۔

آیت 81 ﴿ اِرْجِعُوْۤا اِلٰۤى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ .... : تم باپ کو جا کر بالکل سچ بات بتاؤ کہ آپ کے

وَ مَا شَهِدْنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَ مَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَ سْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا

وَ الْعِيْرَ الَّتِيْۤ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ؕ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۸۲﴾

گواہی دی جو ہم جانتے ہیں اور ہم غیب کی حفاظت کرنے والے نہیں ہیں ﴿81﴾ اور آپ بستی والوں سے پوچھ لیجیے جہاں ہم رہے اور اس قافلے والوں سے بھی جس میں ہم واپس آئے اور بے شک ہم یقیناً سچے ہیں ﴿82﴾

بیٹے نے چوری کی ہے۔ اس کے سامان سے بادشاہ کا پیالہ نکلا ہے، جس کی وجہ سے وہ وہاں پکڑا گیا ہے۔ تمھارے واپس نہ جانے کی صورت میں باپ اور زیادہ پریشان ہو گا کہ پتا نہیں ان کے ساتھ وہاں کیا معاملہ پیش آ گیا ہے، اس لیے جو کچھ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے باپ کے سامنے جا کر بیان کر دو۔ تم باپ کو یہ بھی بتا دو کہ ہم نے خود عزیزِ مصر کے سامنے گواہی دی تھی کہ جس کے سامان سے پیالہ نکلے گا اسے آپ اپنے پاس رکھ لیں، کیوں کہ ہمارے ہاں اگر کوئی ایسا جرم کرے تو اس کی یہی سزا ہے۔ تم باپ سے کہنا: ﴿ وَ مَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴾ ہم نے تو قسمیں کھا کر گواہی دی تھی کہ چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر آئیں گے لیکن ہمیں کیا پتا تھا کہ آپ کا بیٹا مصر میں جا کر چوری کرے گا اور اسے وہیں رکھ لیا جائے گا۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ وہاں پر ایسا ہو جائے گا تو ہم کبھی اسے اپنے ساتھ لے کر نہ جاتے اور نہ ہی آپ کے ساتھ یہ پختہ عہد کرتے کہ ہم اسے واپس لے کر آئیں گے۔ یہ ساری باتیں غیب کی ہیں اور غیب کی باتوں کو تو ہم نہیں جانتے، لہٰذا اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ غلطی اس کی ہے جو وہاں پکڑا گیا ہے۔ یہ ساری باتیں انھیں بڑا بیٹا سمجھا رہا ہے اور کہتا ہے کہ تم باپ کو بالکل کھری اور صاف بات بتاؤ گے تو شاید وہ تمھارا اعتبار کر لے، ورنہ اِدھر اُدھر کی باتوں سے مطمئن کرنے کی کوشش کرو گے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ یوسف کے معاملہ میں قمیص کو خون لگا کر بھیڑیے کے کھا جانے والی بات کر کے تم خود ساری صورتِ حال دیکھ ہی چکے ہو۔

آیت 82 ﴿ وَ سْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا ﴾ ....: برادرانِ یوسف نے باپ کے پاس آ کر ساری بات بیان کی تو ساتھ ہی اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا کہ اگر آپ تحقیق کرنا چاہتے ہیں تو مصر جا کر پوچھ لیں جہاں ہم رہ کر آئے ہیں اور یا پھر قافلے میں شامل قریب کی بستیوں کے لوگ جو ہمارے ساتھ آئے ہیں، ان سے پوچھ لیں، آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم سچ کہہ رہے ہیں۔ ہم نے آپ سے کسی قسم کا کوئی جھوٹ نہیں بولا اور نہ ہی اپنی طرف سے کوئی قصہ کہانی بنا کر پیش کی ہے۔ یہ ساری شہادتیں وہ اس لیے پیش کر رہے ہیں کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ ابا جان ہماری بات پر اعتبار نہیں کریں گے۔

قَالَ بَلۡ سَوَّلَتۡ لَكُمۡ اَنۡفُسُكُمۡ اَمۡرًا ؕ فَصَبۡرٌ جَمِيۡلٌ ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّاۡتِيَنِىۡ

کہا بلکہ تم نے اپنے طور پر ایک خوبصورت بات بنالی ہے، پس صبر ہی بہت بہتر ہے، ہوسکتا ہے کہ اللہ ان سب کو میرے

آیت 83 ﴿ قَالَ بَلۡ سَوَّلَتۡ لَكُمۡ اَنۡفُسُكُمۡ اَمۡرًا : یعقوب علیہ السلام بیٹوں کی بات سن کر کہتے ہیں کہ تم نے اپنی طرف سے ایک خوب صورت بات بنالی ہے اور بیٹے کی چوری اور گرفتاری کی خبر سنا کر مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ پیچھے بیان ہوا ہے کہ بھائی یوسف علیہ السلام کی قمیص لے کر آئے تو اس وقت بھی یعقوب علیہ السلام نے یہی فقرہ بولا تھا کہ تم جھوٹ بولتے ہو، تم نے اپنی طرف سے ایک کہانی گھڑ لی ہے، جبکہ یہاں بھی بیٹوں کی بات سن کر وہی الفاظ دہرائے ہیں: ﴿ بَلۡ سَوَّلَتۡ لَكُمۡ اَنۡفُسُكُمۡ اَمۡرًا ﴾ کہ تم نے اپنی طرف سے ایک بات بنالی ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بارے میں تو بیٹوں نے جھوٹ بولا تھا لیکن اس موقع پر انھوں نے جھوٹ نہیں بولا بلکہ ان کے سامنے جو واقعہ پیش آیا اسے اسی طرح بیان کر دیا، لیکن والد کو یقین اس لیے نہیں آیا کہ جھوٹا شخص سچ بات بھی کرے تو اس کا اعتبار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ بہرحال ان ساری چیزوں میں رب تعالیٰ کی حکمتیں ہیں۔

بعض لوگ اس واقعہ سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یعقوب علیہ السلام کو غیب کی خبریں تھی، یہی وجہ ہے کہ جب وہ یوسف علیہ السلام کی قمیص پر جھوٹا خون لگا کر آئے تو انھوں نے کہہ دیا تھا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو، لیکن آپ دیکھیں کہ جب بیٹے سارا واقعہ بالکل سچ سچ بیان کر رہے ہیں تو اس موقع پر بھی یعقوب علیہ السلام نے وہی بات کہی ہے جو پہلے کی تھی۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یعقوب علیہ السلام نہ یوسف علیہ السلام والے واقع کے بارے غیب جانتے تھے اور نہ ہی اس موقع پر انھیں غیب کا علم تھا۔ انھیں اس حقیقت کی بالکل خبر نہیں تھی کہ یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا ہے، اسی طرح چھوٹے بیٹے کے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کے اصل حقائق سے بھی وہ لاعلم تھے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ سے یہ بات واضح کی ہے کہ نبی ہو یا کوئی اور، رب تعالیٰ کے سوا کوئی غیب جاننے والا نہیں ہے۔ غیب کا معاملہ اللہ رب العالمین کے ساتھ خاص ہے۔

فَصَبۡرٌ جَمِيۡلٌ : ''پس صبر ہی بہت بہتر ہے۔'' یعقوب علیہ السلام کہتے ہیں کہ اب میرے لیے صبر کے بغیر اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ صبر بہت اچھی اور خوب صورت چیز ہے، اسی سے یہ ساری چیزیں برداشت ہوسکتی ہیں۔ صبرِ جمیل کہتے ہیں کہ بندہ کسی بھی نقصان پر مایوس اور ناامید نہ ہو، جزع فزع نہ کرے، آپے سے باہر نہ ہو اور واویلا نہ کرے بلکہ اس نقصان کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتا رہے۔ ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی بہتان کے موقع پر، جب ہر طرف سے بے بسی و مایوسی دیکھی تو یہی الفاظ بولے کہ میں بھی وہی کہتی ہوں جو یوسف علیہ السلام کے باپ نے کہا تھا: ﴿ فَصَبۡرٌ جَمِيۡلٌ ؕ وَاللّٰهُ الۡمُسۡتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوۡنَ ﴾ [یوسف: ۱۸] ''پس صبر ہی بہتر ہے اور اس بات پر اللہ سے مدد

بِهِمْ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۸۳﴾

پاس لے آئے، بے شک وہی مکمل علم والا، حکمت والا ہے ﴿83﴾

مانگی جاتی ہے جو تم بیان کر رہے ہو۔'' [دیکھیے صحیح البخاري، کتاب المغازي، باب حدیث الإفك : ٤١٤١] صبرِ جمیل کرنے والا شخص دنیا میں بڑے سے بڑے نقصان پر بھی مایوس نہیں ہوتا۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے : ((اَلصَّبْرُ ضِيَاءٌ)) [صحیح مسلم، کتاب الطھارۃ، باب فضل الوضوء : ٢٢٣] ''صبر روشنی ہے۔'' کچھ بھی ہو جائے جب تک بندہ صبر کرتا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرماتا ہے اور اس کے لیے خیر کے دروازے کھول دیتا ہے۔ خیر اور بھلائی کے دروازے اس شخص کے لیے بند ہوتے ہیں جو مایوس ہوتا ہے۔ جو نقصان پر صبر نہیں کر سکتا اس کے لیے مایوسیاں اور نا امیدیاں ہی ہوتی ہیں۔ یعقوب علیہ السلام کا صبر دیکھیں کہ پہلے یوسف علیہ السلام گم ہوئے، اب دوسرے دو بیٹوں کے نہ آنے کی خبر سن رہے ہیں، لیکن زبان پر کوئی شکوہ اور شکایت نہیں ہے بلکہ صبرِ جمیل اور اللہ کی رضا پر راضی رہنے کی بات کر رہے ہیں۔

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا : ہوسکتا ہے کہ اللہ ان سب کو میرے پاس لے آئے۔ یعقوب علیہ السلام کہتے ہیں مجھے رب تعالیٰ پر پورا یقین ہے کہ وہ یوسف اور دوسرے دونوں بیٹوں کو بھی مجھ سے ملا دے گا۔ میں صبر کرتا ہوں اور مایوس ہونے کی بجائے اپنے رب سے دعا کرتا ہوں۔ اس میں مسلمانوں کے لیے یہ سبق ہے کہ کاروبار میں نقصان ہو جائے، گھاٹا پڑ جائے، بہت قریبی عزیز فوت ہو جائے یا کوئی اور معاملہ پیش آجائے، ہر معاملے کو اللہ کی تقدیر کی طرف لوٹا دینا چاہیے۔ نبی اکرم ﷺ نے ایسے موقع پر کہنے کے لیے یہ الفاظ سکھائے ہیں: ((قَدَّرَ اللّٰهُ وَمَا شَاءَ فَعَلَ)) [صحیح مسلم، کتاب القدر، باب في الأمر بالقوۃ .... : ٢٦٦٤، سنن ابن ماجہ : ٧٩] اللہ نے جو چاہا کر دیا میں اس کی تقدیر پر راضی ہوں۔ انسان کو زندگی میں قدم قدم پر ایسے معاملات پیش آتے رہتے ہیں، اس لیے یہ دعا یاد کر لینی چاہیے اور کسی بڑے سے بڑے نقصان پر بھی یہی الفاظ زبان سے ادا کرنے چاہییں۔ اللہ کی تقدیر پر ایمان سے بندے کو بہت زیادہ اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ جس کا تقدیر پر ایمان صحیح نہیں ہوتا وہ ہر وقت روتا پیٹتا، مایوس ہوتا، کپڑے پھاڑتا اور جزع فزع کرتا رہتا ہے۔

اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ : ''بے شک وہی مکمل علم والا، حکمت والا ہے۔'' یعقوب علیہ السلام کہتے ہیں کہ پہلے تم نے یوسف کو بھیڑیے کے کھا جانے کی بات کی اور اب تم مجھے دوسرے بیٹے کی چوری کی بات بتا رہے ہو، لیکن اصل علم میرے اللہ کے پاس ہے۔ دنیا کے اندر رونما ہونے والے واقعات میں کیا حکمتیں ہوتی ہیں، یہ وہی بہتر جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ

وَ تَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ يٰۤاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَ ابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾

اور انھوں نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا اور کہنے لگے ہائے افسوس یوسف (کی جدائی) پر! اور ان کی آنکھیں غم سے سفید ہو چکی تھیں، پس وہ درد سے بھرے ہوئے تھے ﴿84﴾

کی صفات پر انسان کا ایمان بہت پختہ ہونا چاہیے۔ رب تعالیٰ کی بہت ساری حکمتیں ہیں جنھیں ہم نہیں سمجھ سکتے، لیکن بطور ایمان اس بات پر پختہ یقین رکھنا چاہیے کہ خالقِ کائنات کی ہر حکمت بہت عظیم ہے۔ یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینکنے والوں نے سوچا کہ ہماری ان سے جان چھوٹ جائے گی لیکن اللہ تعالیٰ علیم اور حکیم ہے۔ اس نے یوسف علیہ السلام کو کنویں سے نکال کر مصر کے تخت پر بٹھا دیا۔ جب بھی کوئی ایسا معاملہ ہو جس میں بظاہر نقصان نظر آ رہا ہو تو اس وقت یہی بات ذہن میں ہونی چاہیے کہ وہ علیم اور حکیم رب جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔ اللہ کی توحید اور صفات کے عقیدہ سے ہماری زندگی میں قدم قدم پر واسطہ پڑتا ہے۔ جب رب تعالیٰ کی ربوبیت اور الوہیت پر انسان کا عقیدہ صحیح ہوتا ہے تو اس کا کردار بہت عمدہ ہوتا ہے۔ معاملے کی خرابی اس وقت ہوتی ہے جب اللہ رب العالمین کی ذات اور صفات پر ایمان کمزور ہو۔

آیت 84 وَ تَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ يٰۤاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ: یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے جب واپس آ کر بتایا کہ آپ کے چھوٹے بیٹے کے سامان سے چوری کا پیالہ نکل آیا ہے، اس لیے اسے وہیں روک لیا گیا ہے اور بڑے بیٹے نے بھی یہ کہہ کر ساتھ واپس آنے سے انکار کر دیا ہے کہ جب تک والد اجازت نہیں دیں گے، یا اللہ تعالیٰ کوئی ایسا فیصلہ نہیں کرے گا جو ہم سب کے لیے بہتر ہو، میں گھر نہیں آؤں گا۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ شاید اسی نے باپ سے وعدہ کیا ہو گا، اس لیے اس کے ذہن پر شدید اثر تھا۔ بہر حال یعقوب علیہ السلام نے یہ باتیں سنیں تو شدید پریشان ہوئے اور منہ پھیر کر وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ وہ غم کی ایسی شدت میں مبتلا ہوئے کہ کہنے لگے ہائے افسوس یوسف کی جدائی پر! اگرچہ ابھی مسئلہ تو چھوٹے بیٹے کا تھا لیکن وہ یاد یوسف علیہ السلام کو کر رہے ہیں۔ گویا دوسرے غم نے ان کے پہلے غم یعنی یوسف علیہ السلام کی جدائی کے زخم کو ایک بار پھر تازہ کر دیا۔

وَ ابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ: ”اور ان کی آنکھیں غم سے سفید ہو چکی تھیں، پس وہ درد سے بھرے ہوئے تھے۔“ یعقوب علیہ السلام نے شدتِ غم میں اس قدر آنسو بہائے کہ ان کی آنکھوں کی سیاہی سفیدی میں بدل گئی۔

”كَظِيْمٌ“ سے مراد وہ غم ہے جسے انسان اپنے دل میں چھپا کر رکھتا ہے اور یہ غم اندر ہی اندر بندے کو گھن کی طرح کھا

قَالُوۡا تَاللّٰهِ تَفۡتَؤُا تَذۡكُرُ يُوۡسُفَ حَتّٰى تَكُوۡنَ حَرَضًا اَوۡ تَكُوۡنَ مِنَ الۡهٰلِكِيۡنَ ﴿۸۵﴾

(برادرانِ یوسف نے) کہا اللہ کی قسم! آپ یوسف کو یاد ہی کرتے رہیں گے، حتیٰ کہ آپ (شدتِ غم سے) نڈھال

رہا ہوتا ہے۔سورۃ آل عمران (۱۳۴) میں ﴿وَ الۡكٰظِمِيۡنَ الۡغَيۡظَ﴾ (غصے کو پی جانے والے) اسی معنی میں ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ عوارض انسان کی طبیعت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔بعض لوگ وہ ہوتے ہیں جو مصیبت و آزمائش آ جانے پر صبر نہیں کر سکتے اور اپنی زبان سے گالی گلوچ یا لڑائی جھگڑا شروع کر دیتے ہیں، لیکن یعقوب علیہ السلام کا کردار دیکھیں کہ ان کا دل غم سے بھرا ہوا تھا مگر وہ اپنے اس غم کو بیان نہیں کر رہے۔ یوسف علیہ السلام کی جدائی پر وہ پہلے ہی شدید صدمے سے دوچار تھے، اب چھوٹے بیٹے کی جدائی پر ان کے غم میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا لیکن صبر انتہا درجے کا ہے۔

آیت 86,85 ﴿قَالُوۡا تَاللّٰهِ تَفۡتَؤُا تَذۡكُرُ يُوۡسُفَ ....﴾: برادرانِ یوسف نے جب والد کو شدتِ غم کی اس کیفیت میں دیکھا تو سارے مل کر انھیں حوصلہ دینے لگے اور کہتے ہیں کہ اے اباجان! آپ ہر وقت یوسف ہی کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ اللہ کی قسم! آپ کی یہ حالت اسی وجہ سے ہوئی ہے۔ اتنا عرصہ گزر گیا اب تو یوسف کی باتیں کرنا چھوڑ دیں اور تھوڑا حوصلہ کریں۔ اگر آپ نے اس غم کو یونہی دل میں چھپائے رکھا تو یہ آپ کو اس قدر تکلیف پہنچائے گا کہ کہیں ایسا نہ ہو آپ یونہی گھل گھل کر مرنے کے قریب ہو جائیں، یعنی غم کی یہ شدت آپ کی موت کا باعث نہ بن جائے۔

﴿قَالَ اِنَّمَاۤ اَشۡكُوۡا بَثِّىۡ وَحُزۡنِىۡۤ اِلَى اللّٰهِ﴾: یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں سے شدتِ غم کی وجہ سے آنسو بہہ رہے ہیں لیکن زبان سے انھوں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی جس سے رب تعالیٰ ناراض ہو، بلکہ وہ کہتے ہیں کہ میں کسی کے سامنے کوئی شکایت نہیں کرتا اور نہ ہی مجھے کسی سے کوئی توقع ہے، میں اپنی بے قراری، غم اور دل کی کیفیت اپنے رب کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ میرا تو سارا معاملہ ہی میرے اللہ کے ساتھ ہے۔ "بَثِّىۡ" اور "حُزۡنِىۡ" دونوں کا معنی غم ہی ہے لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ "بَثٌّ" وہ غم ہے جو ظاہر ہو جائے، یعنی بے قراری اور بے چینی کی شکل میں انسان کو نیند نہ آئے اور اس کے چہرے پر غم کی شدت کا اثر واضح ہو اور "حُزۡن" اس غم کو کہتے ہیں جو دل میں چھپا ہوا ہو، اندر ہی اندر بندے کو کھائے جا رہا ہو اور اس کی شدت بڑھتی جا رہی ہو۔ یعقوب علیہ السلام کہتے ہیں کہ میری یہ بے قراری اور میرا یہ غم جو کچھ بھی ہے میں اس کی شکایت اپنے اللہ کے سامنے کرتا ہوں۔

یعقوب علیہ السلام تقدیر پر بات نہیں کر رہے اور نہ ہی یہ شکوہ کر رہے ہیں کہ اے اللہ! تو نے میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا؟ بلکہ اپنے دل کی کیفیت اپنے رب کے سامنے پیش کی ہے۔حقیقت ہے کہ یہ چیز بہت بڑی دعوت ہے۔ نبیوں پر بھی غم آتے ہیں لیکن ان کا رویہ بہت صبر والا ہوتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لختِ جگر ابراہیم فوت ہوئے تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اپنے ہاتھوں میں اٹھایا ہوا ہے، آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں اور شدتِ غم کی وجہ سے آپ کہہ

قَالَ اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۝۸۶

رہیں گے، یا آپ ہلاک ہو جائیں گے (85) انھوں نے کہا بے شک میں اپنی بے قراری اور اپنے غم کی شکایت صرف اللہ سے کرتا ہوں اور میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے (86)

رہے ہیں: « إِنَّ الْعَيْنَ تَدْمَعُ، وَالْقَلْبَ يَحْزَنُ، وَلَا نَقُوْلُ إِلَّا مَا يَرْضٰى رَبُّنَا، وَإِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا إِبْرَاهِيْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ » [صحيح البخاري، كتاب الجنائز، باب قول النبي ﷺ: «إنا بك لمحزونون»: ۱۳۰۳] ”بے شک آنکھ آنسو بہاتی ہے اور دل غمگین ہے اور ہم اس کے سوا کچھ نہیں کہتے جو ہمارے رب کو پسند ہو اور بے شک ہم تیری جدائی کی وجہ سے اے ابراہیم! یقیناً بہت غمزدہ ہیں۔“ اللہ کے رسول ﷺ نے یہ بات عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے جواب میں اس وقت کہی تھی جب انھوں نے آپ ﷺ سے سوال کیا تھا کہ آپ بھی مصیبت کے وقت میں روتے ہیں؟ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ رب العالمین آنسو بہانے اور دل کی غمگینی پر عذاب نہیں دیتا بلکہ زبان کی شکایت پر عذاب دیتا ہے۔ [دیکھیے صحيح البخاري، كتاب الجنائز، باب البكاء عند المريض: ۱۳۰۴]

نبی بھی انسان ہوتے ہیں اور ان کا غم میں مبتلا ہو جانا بھی فطری امر ہے۔ غم کی شدت زیادہ ہو تو کبھی آنکھیں بہنے لگتی ہیں اور بندہ بے قراری کا اظہار کر دیتا ہے۔ یعقوب علیہ السلام بھی اپنی اسی کیفیت کا اظہار کر رہے ہیں کہ اے اللہ! میں کمزور ہوں، مجھ پر غم کا اتنا اثر ہو گیا ہے کہ میری بے قراری دنیا دیکھنے لگ گئی ہے۔ میرے اضطراب کی کیفیت میرے بیٹوں نے بھی محسوس کی ہے۔ اے اللہ! میرے غم کو تو ہی جانتا ہے اور اس کی شکایت بھی تیرے ہی سامنے کر رہا ہوں، کیوں کہ تکلیف اور غم صرف تو نے ہی دور کرنے ہیں۔ اس کے سوا غم ختم ہونے کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ یہاں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جب کبھی کوئی بہت زیادہ شدت کا معاملہ ہو تو اپنی کمزوری اور کوتاہی بیان کر کے اللہ رب العالمین سے مدد طلب کرنی چاہیے۔ ایک صحیح عقیدہ رکھنے والا شخص کبھی اپنے رب کے سامنے یہ شکوہ نہیں کرتا کہ یا اللہ! تو نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا ہے؟ اس کی زبان سے کبھی ایسے بے صبری والے الفاظ نکلتے ہی نہیں ہیں۔

وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ: ”اور میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔“ یعقوب علیہ السلام کی طرف سے ” اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ “ کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں غیب جانتا ہوں بلکہ ان کا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ یوسف (علیہ السلام) کے خواب کی تعبیر مجھے معلوم ہے، ایک وقت آئے گا جب یوسف مجھ سے مل کر رہے گا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: اس سے مراد یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام نے جو خواب اپنے باپ کے سامنے بیان کیا تھا وہ ان کے ذہن میں موجود تھا اور اسی وجہ سے انھیں امید رہتی تھی کہ یوسف کبھی نہ کبھی ہمیں ضرور ملیں گے اور ان کا خواب بھی پورا ہو گا۔ [دیکھیے تفسیر الطبري: ۱۳ / ۳۰۷]

یٰبَنِیَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ یُّوْسُفَ وَ اَخِیْهِ وَ لَا تَایْــَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا یَایْــَٔسُ

اے میرے بیٹو! جاؤ! پس یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو اور اللہ کی رحمت سے نااُمید نہ ہونا، بے شک حقیقت یہ

آیت 87 ﴿ یٰبَنِیَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ یُّوْسُفَ وَ اَخِیْهِ : یعقوب علیہ السلام چھوٹے بیٹے کی خبر سن کر شدتِ غم سے نڈھال ہوئے تو یوسف علیہ السلام کا خواب یاد کر کے بیٹوں سے کہنے لگے کہ تم جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو۔ پیچھے یہ بات بیان ہوئی ہے کہ بھائیوں نے جب باپ کے سامنے یوسف کو بھیڑیے کے کھا جانے کی بات کی تو انھوں نے کہا تھا کہ یہ تمھارے نفسوں نے اپنی طرف سے کہانی گھڑی ہے۔ میں اس بات کو نہیں مانتا کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا۔ یعقوب علیہ السلام سمجھتے تھے کہ یوسف زندہ ہے، اسی لیے اب وہ اپنے بیٹوں سے یوسف کو تلاش کرنے کا کہہ رہے ہیں۔ یہاں ایک بات سمجھ لیں کہ ایک ہوتا ہے ''تحسس'' اور ایک ہوتا ہے ''تجسس''، دونوں کا مطلب تلاش کرنا ہے، لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ ''تحسس'' اس چیز کے تلاش کرنے کو کہتے ہیں جو بہت اچھی ہو اور اس کے تلاش کرنے کا طریقہ بہت شان دار ہو جبکہ ''تجسس'' کسی غلط چیز کو تلاش کرنے کے لیے غلط انداز اختیار کرنے کو کہتے ہیں۔ یعنی کسی کے عیب تلاش کرنا اور اس ٹوہ میں لگے رہنا کہ اس کی کوئی غلطی مل جائے تا کہ اسے مجلس میں پھیلایا جائے اور پروپیگنڈا کر کے بدنام کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ''تحسس'' کا لفظ استعمال کیا، اس میں بہت لطیف نکتہ ہے۔ یعقوب علیہ السلام بیٹوں سے کہہ رہے ہیں: ﴿ فَتَحَسَّسُوْا مِنْ یُّوْسُفَ وَ اَخِیْهِ ﴾ تم جاؤ یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو۔ یوسف کی طرح اب تم دوسرے بھائی کو بھی چھوڑ آئے ہو اور مجھے تسلیاں دینے کی کوشش کر رہے ہو۔

وَ لَا تَایْــَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ . . . : یوسف علیہ السلام کو گم ہوئے بہت مدت گزر چکی ہے، اس دوران نہ جانے کیا کچھ ہوا ہو گا، وقت زیادہ گزر جائے تو مایوسی اور پریشانی بھی بڑھ جاتی ہے لیکن یعقوب علیہ السلام کہہ رہے ہیں کہ تم نے اپنی طرف سے کوشش جاری رکھنی ہے اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا۔ کوئی کام خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو مسلمان اپنے اللہ سے یہی امید رکھتے ہیں کہ وہ ضرور ہمیں یہ چیز عطا فرمائے گا۔ انسان کی نیت خالص اور عمل اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق ہو تو اس کیفیت میں رب تعالیٰ کی رحمت کی امید رکھنا ایمان کی نشانی ہے۔ ایسے امید رکھنے والے مومن ناکام نہیں ہوا کرتے۔ مایوس شخص کبھی اپنی محنت کے تسلسل کو جاری نہیں رکھ سکتا۔ بندہ جب مایوسی سے دوچار ہوتا ہے تو بے بس ہو کر کام چھوڑ دیتا ہے اور اگر مایوسی نہ ہو تو انسان ہمیشہ محنت اور کوشش کرتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کی مناسبت سے ایمان والوں کو یہ بات سمجھائی ہے۔

قرآن مجید دعوت اور تربیت کی کتاب ہے۔ اس کی ایک ایک بات میں دعوت ہے۔ یوسف علیہ السلام برسوں پہلے گم ہو چکے ہیں، باپ کو کچھ خبر نہیں کہ ان کے ساتھ کیا بنا ہے لیکن اس خواب کی بنا پر ان کے ذہن میں امید موجود ہے

مِنۡ رَّوۡحِ اللّٰہِ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۸۷﴾

ہے کہ اللہ کی رحمت سے صرف کافر لوگ ہی ناامید ہوتے ہیں ﴿87﴾

کہ اللہ تعالیٰ یوسف (علیہ السلام) کو ان کے ساتھ ضرور ملائے گا، اسی لیے وہ اپنے بیٹوں سے کہتے ہیں کہ تم جاؤ اور انھیں تلاش کرو۔ اللہ رب العالمین تمھاری کوششوں کو ضرور کامیاب کریں گے۔ مایوس ہمیشہ کافر ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے وسائل پر اعتماد کرتے ہیں اور ان کی نظریں اسلحہ، طاقت و قوت، ٹیکنالوجی اور ظاہری اسباب پر ہوتی ہیں جبکہ اہلِ ایمان ظاہری اسباب بھی اختیار کرتے ہیں لیکن ان کی اصل امید اپنے رب پر ہوتی ہے۔ وہ مایوس ہوئے بغیر اپنا کام جاری رکھتے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ کچھ دیر کے لیے بندے کو کامیابی نہ ملے تو مایوس ہو کر اس کام کو ہی چھوڑ دیا جائے۔ بعض لوگ کشمیر کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہاں تحریکِ آزادی کا کیا فائدہ ہوا؟ ایسی ہی باتیں پہلے افغانستان کے متعلق بھی کی جاتی تھیں۔ اللہ نے افغان مسلمانوں کو کامیابیوں سے نوازا ہے تو کشمیریوں کو بھی غاصب بھارت سے آزادی مل کر رہے گی۔ (ان شاء اللہ) میدانوں میں بہنے والا خون کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔ اس لیے مایوسیاں پھیلانے والی باتیں کرنا حقیقت میں ایمان اور عقیدے کے منافی چیزیں ہیں۔

جہاد اللہ کا حکم ہے اور ہم نے اس کا حکم مان کر قربانیاں پیش کرنی ہیں۔ تاخیر میں کیا حکمت ہے یہ رب تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔ اس نے کب اور کس وقت کامیابی عطا کرنی ہے یہ اسی کے علم میں ہے۔ مسلمانوں کا یقین یہ ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہماری مدد کرے گا اور ہمیں ناکام نہیں کرے گا۔ ہم اللہ کی حکمتوں پر ایمان رکھتے ہیں لیکن ان کے متعلق جانتے نہیں ہیں۔ کافر ہمیشہ نتیجے پر نظر رکھتا ہے جبکہ مسلمان کی نظر اپنے رب کے حکم پر ہوتی ہے۔ اس کا یقین ہوتا ہے کہ نتیجہ اللہ رب العزت کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اللہ کے حکم پر لبیک کہتے ہوئے قربانیاں پیش کرتا ہے اور اس کی رحمت سے مایوس اور ناامید نہیں ہوتا۔ وہ میدانوں میں استقامت اختیار کرتے ہوئے بڑی سے بڑی قوتوں کے خلاف ڈٹ جاتا ہے اور بالآخر کامیابی مسلمانوں کو ہی ملا کرتی ہے۔

آپ دیکھیں کہ پہلی صلیبی جنگ نوے سال بعد کامیاب ہوئی۔ صلاح الدین ایوبی سے پہلے نورالدین زنگی کا دور اور اسی طرح دوسرے کئی مختلف ادوار گزرے ہیں۔ اس سارے عرصہ میں کتنے لوگ شہید ہوئے اور نسلیں بدل گئیں لیکن قربانیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اگر مسلمان یہ سوچ کر جہاد ترک کر دیتے کہ کامیابی تو مل نہیں رہی تو جو شاندار نتیجہ صلاح الدین ایوبی کو ملا وہ اس سے محروم رہ جاتے اور بیت المقدس کو آزادی نہ مل سکتی۔ اس سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ مسلمانوں کو ہمیشہ اللہ کی رحمت پر امید رکھتے ہوئے اپنے کام کو جاری رکھنا چاہیے۔ یہ بہت بڑا سبق اور دعوت ہے۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ وَ جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ۸۸

پس جب وہ اس (یوسف علیہ السلام) کے پاس آئے تو کہنے لگے اے عزیز! ہمیں اور ہمارے اہل و عیال کو بڑی تکلیف پہنچی ہے اور ہم حقیر سی قیمت لے کر آئے ہیں، پس آپ ہمیں پورا ماپ دے دیں اور ہم پر صدقہ کریں، بے شک اللہ صدقہ کرنے والوں کو جزا دیتا ہے (88)

بعض اوقات وقتی چیزیں دیکھ کر انسان مایوس ہونے لگتا ہے کہ کامیابی تو مل نہیں رہی اس لیے وہ اس کام کو ہی چھوڑ دیتا ہے، یہ رویہ درست نہیں ہے۔ یعقوب علیہ السلام کی سیرت سے بھی یہی بات سمجھ آ رہی ہے کہ مایوس اور ناامید کافر ہوتے ہیں، مسلمان کبھی اپنے رب کی رحمت سے مایوس نہیں ہوا کرتے بلکہ ہر معاملہ میں اپنے رب پر حسنِ ظن رکھتے ہیں۔ اسی حسنِ ظن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، حدیث قدسی ہے: ((أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ)) [صحیح البخاري، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالٰی: ﴿ویحذر کم اللہ نفسہ ...﴾ : ۷۴۰۵] ”میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق ہوتا ہوں جو وہ میرے متعلق رکھتا ہے۔“

آیت 88 ﴿ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ . . . : یعقوب علیہ السلام کے حکم پر بیٹے سامان تیار کر کے نکلے اور یوسف علیہ السلام کے پاس مصر پہنچ گئے۔ وہاں جا کر انھوں نے سارے حالات بیان کیے کہ قحط کی وجہ سے معاملات کس قدر خراب ہیں، گھر میں کھانے کے لیے کچھ نہیں اور پھر چھوٹے بھائی کے ساتھ نہ جانے کی وجہ سے باپ سخت صدمے کی کیفیت میں ہے۔ غم کی شدت اتنی ہے کہ آنسو بہا بہا کر ان کی آنکھیں سفید ہو گئی ہیں اور طبیعت نڈھال ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ کہنے لگے کہ اے عزیز! ہمیں اور ہمارے اہل و عیال کو بڑی تکلیف پہنچی ہے اور اس مرتبہ تو ہم کوئی تیاری اور کوئی قیمت بھی اکٹھی نہیں کر سکے، بس تھوڑا بہت جو کچھ ہمارے پاس تھا وہ لے آئے ہیں۔ یہ تو اس قابل بھی نہیں ہے کہ ہم اسے قیمت کے طور پر پیش کر سکیں۔ ”بِبِضَاعَةٍ“ کا مطلب ہوتا ہے قیمت اور ”مُّزْجٰىةٍ“ بالکل معمولی سی، یعنی اتنا تھوڑا کہ اس کی قیمت پر کچھ نہ ملے اور لوگ اسے لینا پسند نہ کریں۔

برادرانِ یوسف نے قحط، خشک سالی اور بیٹوں کی جدائی کے سبب پیش آنے والے گھر کے حالات کا انتہائی بے بسی اور بے چارگی کے ساتھ تذکرہ کیا اور کہنے لگے: ﴿ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا ﴾ پس جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ آپ ہم سے لے لیں، ہمیں غلہ پورا ماپ کر دے دیں اور ہم پر صدقہ کریں۔ مطلب یہ کہ جتنی قیمت ہم دے رہے ہیں اس کے بدلے میں غلہ تو نہیں مل سکتا، لہٰذا آپ جو کچھ ہمیں دیں گے وہ ہمارے لیے صدقہ ہو گا۔

قَالَ هَلۡ عَلِمۡتُمۡ مَّا فَعَلۡتُمۡ بِیُوۡسُفَ وَ اَخِیۡهِ اِذۡ اَنۡتُمۡ جٰهِلُوۡنَ ﴿۸۹﴾ قَالُوۡۤا ءَاِنَّكَ لَاَنۡتَ

(یوسف علیہ السلام نے) کہا کیا تمھیں علم ہے کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا، جبکہ تم نادان تھے؟﴿89﴾ کہنے لگے

اِنَّ اللّٰهَ یَجۡزِی الۡمُتَصَدِّقِیۡنَ: ''بے شک اللہ صدقہ کرنے والوں کو جزا دیتا ہے۔'' ہم تو آپ کو کچھ نہیں دے سکتے لیکن اگر آپ صدقہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ آپ کو ضرور دے گا گے۔

آیت 89 قَالَ هَلۡ عَلِمۡتُمۡ مَّا فَعَلۡتُمۡ بِیُوۡسُفَ وَ اَخِیۡهِ . . . : یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کی زبان سے یہ ساری باتیں سنیں تو ان کا دل پسیج گیا اور وہ اس کیفیت کو برداشت نہ کر سکے۔ وہ بھائیوں سے کہنے لگے کہ تمھیں یاد ہے تم نے اپنے بھائی یوسف کے ساتھ کیا کیا تھا " اِذۡ اَنۡتُمۡ جٰهِلُوۡنَ " ''جبکہ تم نادان تھے؟'' یوسف علیہ السلام نے اس موقع پر بھی یہ نہیں کہا کہ تم نے بڑا ظلم کیا تھا۔ برادرانِ یوسف نے حسد کی وجہ سے اپنے بھائی کے ساتھ اتنا بڑا جرم کیا اور اسے کنویں میں پھینک کر باپ کو سخت پریشان کیا لیکن یوسف علیہ السلام کا صبر دیکھیں کہ وہ کہہ رہے ہیں تم نے یہ سارا کچھ نادانی میں کیا تھا، تمھیں پتا نہیں تھا کہ تم جو کچھ کر رہے ہو اس کے نتائج کیا نکلیں گے۔ یوسف علیہ السلام کا یہ رویہ امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بہت بڑی دعوت اور صبر کا پیغام ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے وارث علمائے کرام اور دین کی دعوت پیش کرنے والے داعی حضرات کو ہمیشہ یہ انداز اختیار کرنا چاہیے کہ ان کے الفاظ بہت شستہ ہوں اور وہ نفرت پیدا کرنے والے نہ ہوں۔ اصل بات تو یہ تھی کہ انھوں نے اپنے بھائی کے ساتھ بڑا ظلم اور زیادتی کی تھی لیکن یوسف علیہ السلام نے اس موقع پر بھی ان کے لیے ''نادان'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

جہالت ایسی چیز ہے کہ اس سے شرک و بے دینی آتی ہے اور بندہ نافرمانیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یوسف علیہ السلام نے اپنی گفتگو میں بہت خوب صورت لفظ استعمال کیے ہیں۔ الفاظ کی شدت ہمیشہ نفرت کا باعث بنتی ہے۔ بندہ بات سننے کی بجائے غصے میں آ جاتا ہے اور قبول کرنے کی بجائے دور ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ یوسف علیہ السلام باپ کے غم کی شدت، آنسو بہا کر آنکھیں سفید ہو جانے اور گھر کے حالات سے متعلق باتیں سن کر یقیناً بہت بے قرار ہوئے ہوں گے اور انھیں سخت تکلیف پہنچی ہو گی، لیکن اس کے باوجود اپنے جذبات پر قابو رکھ کر فیصلے کر رہے ہیں۔ نبی جو فیصلہ کرتا ہے اللہ کے حکم سے کرتا ہے۔ پہلے حکم یہ تھا کہ ابھی چھپا کر رکھنا ہے، یہی وجہ ہے کہ بھائی دو مرتبہ پاس آئے ہیں لیکن یوسف علیہ السلام نے ان پر کچھ بھی واضح نہیں کیا، لیکن تیسری مرتبہ آئے تو آپ نے ان پر سارے راز کھول دیے، البتہ آپ کا بیان کرنے کا انداز بہت شان دار ہے۔ نبی کے وارثوں کا رویہ اور انداز بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔

آیت 90 قَالُوۡۤا ءَاِنَّكَ لَاَنۡتَ یُوۡسُفُ . . . : برادرانِ یوسف نے جب یہ بات سنی تو فوراً سوچ میں پڑ گئے کہ اتنی پرانی بات عزیزِ مصر کو کیسے معلوم ہو گئی؟ کہنے لگے کہ لگتا ہے آپ ہی یوسف ہیں ورنہ یہ بات تو کسی کو معلوم نہیں تھی۔ اس پر

یُوۡسُفُ ؕ قَالَ اَنَا یُوۡسُفُ وَ هٰذَاۤ اَخِیۡ ۫ قَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیۡنَا ؕ اِنَّهٗ مَنۡ یَّتَّقِ وَ یَصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۹۰﴾

کیا بے شک تم ہی یوسف ہو؟ کہا میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ یقیناً اللہ نے ہم پر بڑا احسان فرمایا، بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اور صبر کرتا ہے تو اللہ ایسے احسان کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا ﴿90﴾

یوسف علیہ السلام کہتے ہیں: ﴿ اَنَا یُوۡسُفُ وَ هٰذَاۤ اَخِیۡ ﴾ ''میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔'' یہاں یہ بات بہت غور طلب ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اس موقع پر یہ نہیں کہا کہ میں نے فلاں تدبیر کی اور فلاں کام کیا جس کی وجہ سے آج میں اس مقام پر پہنچ گیا ہوں بلکہ وہ کہتے ہیں: ﴿ قَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیۡنَا ﴾ یقیناً اللہ نے ہم پر بڑا احسان فرمایا۔ یعنی ہر اچھی بات کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف کر رہے ہیں۔

یوسف علیہ السلام بہت زیادہ تکلیفوں سے گزرے۔ انھیں کنویں میں پھینکا گیا، وہ مصر کے بازار میں فروخت ہوئے اور قید خانے میں رہے لیکن اس کے باوجود ان کی زبان پر تکلیفوں اور پریشانیوں کا نہیں بلکہ اللہ کے احسانات کا تذکرہ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ نبیوں کی طرز پر دعوتِ دین کا کام کرنا ہو تو مثبت سوچ رکھتے ہوئے اپنے مسائل اور مشکلات ہی بیان نہیں کرتے رہنا چاہیے بلکہ صبر و استقامت اور حوصلے کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہر وقت اپنے رب کو یاد رکھنا چاہیے۔ حقیقت ہے کہ یہ عقیدہ و منہج میں کمزوری کی علامت ہوتی ہے کہ بندہ مشکلات آنے پر واویلا شروع کر دے۔ آپ دیکھیں کہ نائن الیون کے بعد جب مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ کا اعلان ہوا تو جہاں افغانستان اور عراق میں آتش و آہن کی بارش کر کے لاکھوں مسلمان شہید کیے گئے وہاں پاکستان اور دوسرے مسلمان ملکوں پر بھی دباؤ بڑھایا گیا، جس پر اسلام و پاکستان سے محبت رکھنے والی بعض شخصیات کو گرفتار کر کے جیلوں میں قید کر دیا گیا۔ جب یہ سارے معاملات ہوئے تو کافر قوتوں کا ٹارگٹ یہ تھا کہ مظلوم مسلمانوں کے حق میں آواز بلند کرنے والوں کا سارا تنظیمی ڈھانچہ ختم کر دیا جائے اور ان کے دعوتی دفاتر، سکول، کالج، ہسپتال، ڈسپنسریاں، ایمبولینسیں اور دوسرے ادارے باقی نہیں رہنے چاہییں۔ اس سلسلہ میں مختلف نوعیت کی پابندیاں لگائی گئیں اور اسلام سے محبت کرنے والوں کو دین کی دعوت اور خدمت کا کام کرنے سے روکا جاتا رہا، لیکن یہ رب تعالیٰ کا احسان ہے کہ انھوں نے صبر و استقامت اختیار کی، اپنے رب سے دعائیں کرتے رہے اور امت اور ملک کے لیے کوئی نقصان دہ قدم نہیں اٹھایا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے دشمن طاقتوں کے یہ مذموم عزائم پورے نہیں ہو سکے۔

دشمن قوتوں کی طرف سے ان پابندیوں اور رکاوٹوں کے دوران اسلام کے داعیان کو قید و بند کی صعوبتیں ضرور

برداشت کرنا پڑیں لیکن دعوتِ دین اور خدمت کا کام آج بھی جاری ہے۔ محبِ وطن شخصیات کے خلاف دہشت گردی کے سب جھوٹے پروپیگنڈے دم توڑ چکے اور لوگوں کی محبتوں میں اور زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ بلاشبہ یہ ساری چیزیں خالقِ کائنات کا بہت بڑا احسان ہیں۔ ہمیں اپنے رب کے ان احسانات کو یاد رکھنا چاہیے۔ جو شخص ہر وقت دوسروں کو اپنی تکلیفیں اور پریشانیاں سناتا رہتا ہے اس کی زبان پر حالات کے شکوے ہی رہتے ہیں اور وہ اپنے رب کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔ جب ان ساری چیزوں سے مثبت پہلو نکال کر اللہ رب العزت کے احسانات کو یاد کیا جائے گا تو پھر ہی بندہ اپنے رب کا شکر ادا کرنے والا بنے گا۔ یعنی صبر کرنے والا بندہ ہی ہمیشہ شکر ادا کرسکتا ہے۔ یوسف علیہ السلام بھی اپنے بھائیوں سے یہی کہہ رہے ہیں کہ آج اگر میں مصر کے تخت پر بیٹھا ہوں اور آپ سب کی مجھ سے ملاقات ہوئی ہے تو یہ اللہ نے ہم پر اپنا احسان کیا ہے۔ آپ ہر نعمت کو اللہ کے فضل اور احسان کے ساتھ منسوب کر کے اس بات کا اظہار کر رہے ہیں کہ یہ سب کچھ رب تعالیٰ کی مدد سے ہوا ہے۔ یوسف علیہ السلام کا ان چیزوں کو خالقِ کائنات کی طرف منسوب کرنا بہت بڑی دعوت ہے کہ دعوت و جہاد کے دوران مصائب و مشکلات اور تکالیف کا سامنا ہو تو ان چیزوں پر صبر و استقامت کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

اِنَّهٗ مَنۡ يَّتَّقِ وَ يَصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ: ''بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اور صبر کرتا ہے تو اللہ ایسے احسان کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔'' وہ لوگ جو دنیا و آخرت میں کامیابیاں حاصل کرنا چاہتے ہیں یوسف علیہ السلام نے ان کے لیے ایک نسخہ اور اصول بیان فرما دیا ہے۔ اس میں بلاشبہ امتِ مسلمہ کے لیے شان دار رہنمائی ہے کہ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ میں نے تقویٰ اختیار کیا اور صبر کیا بلکہ وہ کہہ رہے ہیں کہ جو کوئی یہ کام کرے گا وہ اللہ کے نزدیک محسن بنے گا اور رب تعالیٰ اسے دنیا و آخرت کے بہترین اجر سے نوازیں گے۔ یوسف علیہ السلام کی زندگی میں کس قدر مشکل مراحل آئے ہیں۔ کنعان سے چل کر مصر تک پہنچے، عزیزِ مصر کے غلام بن کر رہے اور قید خانے میں کئی برس گزارے لیکن اپنی خوبیاں بیان کرنے کی بجائے ان دو جملوں میں انھوں نے ایک بہترین اصول واضح کر دیا ہے۔ آج بھی جو کوئی چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے دین کی خدمت اور جہاد کا کام لے اور اس کی کاوشوں کو نتیجہ خیز بنائے اس کے لیے نسخہ یہی ہے کہ اپنی پوری زندگی میں قدم قدم پر تقویٰ اور صبر اختیار کرے۔

دنیا میں رہتے ہوئے بعض اوقات ایسے مسائل پیش آتے ہیں کہ بندہ سخت پریشانی و آزمائش سے دوچار ہو جاتا ہے، انسان کا نفس اسے پریشان کرتا ہے، ماحول کی خرابیاں اثر انداز ہوتی ہیں اور شیطان وسوسے ڈالتا ہے۔ جب انسان ان راستوں سے گزرتا ہے تو کانٹوں سے بچنے کی طرح نافرمانیوں سے بچنا پڑتا ہے۔ پھونک پھونک کر قدم رکھنے اور گناہوں سے بچ کر رب تعالیٰ کی فرماں برداری اختیار کرنے کا نام تقویٰ ہے، جیسا کہ ابن حیان نے اپنی تفسیر میں

لکھا ہے: ((اِمْتِثَالُ الْأَوَامِرِ، وَاجْتِنَابُ النَّوَاهِيْ)) [البحر المحيط في التفسير : ۲/ ۲۴۰] یعنی اللہ رب العزت کے اوامر کی پابندی کرنا اور گناہوں سے بچتے ہوئے مسلسل نیکی کا رویہ اپنانا، دونوں چیزیں تقویٰ میں شامل ہیں۔ ملکوں و معاشروں اور کفر کی حکومتوں میں رہتے ہوئے بندوں کو ہر طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یوسف علیہ السلام بھی جب مصر آئے تو اس وقت وہاں اسلام کی حکومت نہیں تھی بلکہ ان کی دعوت سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ وہاں شرک کے مفاسد عام تھے۔ بتوں کی پوجا کی جاتی اور دوسری چیزوں کو الٰہ بنایا جاتا تھا۔ ایسے میں زنانِ مصر کا جو کردار تھا، اس سے معاشرے کی صحیح تصویر سامنے آتی ہے۔ اسی طرح جس انداز میں ناانصافی کا رویہ اختیار کرتے ہوئے یوسف علیہ السلام کو قید میں ڈالا گیا اس سے پتا چلتا ہے کہ وہاں ظلم کی حکومت تھی۔

عزیزِ مصر جان چکا تھا کہ قصور یوسف علیہ السلام کا نہیں اس کی بیوی کا ہے۔ اس چیز کا عزیز نے برملا اظہار بھی کیا کہ ﴿ يُوسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هَٰذَا ﴾ [یوسف : ۲۹] یوسف اس بات کو جانے دو اور کسی اور سے اس بارے میں بات نہ کرنا، ورنہ میری عزت برباد ہو جائے گی۔ اسی طرح وہ عورت سے کہتا ہے کہ غلطی تیری ہے اس لیے ﴿ اسْتَغْفِرِي لِذَنبِكِ ﴾ [یوسف : ۲۹] تو اپنے گناہ پر استغفار کر۔ ان چیزوں سے صاف واضح ہوتا ہے کہ مصر کا معاشرہ اس وقت ایسا تھا کہ وہاں شرک کی طرح بے حیائی، فحاشی اور بدکرداری انتہا درجے کی تھی۔ ایسا معاشرہ جہاں ظلم اور ناانصافی عام ہو وہاں رہ کر خود کو بچانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس کے لیے راستہ صرف یہی ہے کہ صبر و استقامت اور تقویٰ کے ساتھ رہا جائے۔ بندہ محسن ان دو خوبیوں کے ساتھ ہی بنتا ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے ہی محسن بندوں کی مدد کرتا اور ان سے دین کی خدمت کا کام لیتا ہے۔ ہم نے جہاد کے میدانوں میں دیکھا ہے کہ چند ایک نوجوان ہزاروں دشمنوں پر بھاری ہوتے ہیں۔ یہ نوجوان اگر دشمن کے پاس بہت زیادہ اسلحہ اور ساز و سامان ہونے کے باوجود کامیاب ہوتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دلوں میں تقویٰ ہوتا ہے اور وہ صبر و استقامت سے کام لیتے ہیں۔

رب تعالیٰ کی اطاعت اور محبت کا جذبہ تقویٰ سے پیدا ہوتا ہے۔ انسان جب نیکی کرتا ہے تو وہ شیطان کے وسوسوں اور تسلط سے بچتا ہے۔ تقویٰ بہت بڑی ڈھال ہے۔ اللہ کے مومن اور مجاہد بندوں کی تہجد اور دوسری نمازیں بہت عمدہ ہوتی ہیں۔ وہ ذکر زیادہ کرتے ہیں اور اپنے رب سے دعائیں اور مناجات بہت کرتے ہیں۔ کفار کے خلاف میدانوں میں برسرِ پیکار رہتے ہوئے ہر وقت ان کے سروں پر خطرات منڈلا رہے ہوتے ہیں، لیکن مجاہدین کی زبان پر کبھی شکوہ نہیں ہوتا۔ وہ ہر وقت خوش و خرم اور اللہ کی رضا پر راضی دکھائی دیں گے۔ ہم اپنے معاشروں میں دیکھیں تو ہر شخص پریشان ہے۔ ہر کسی کے شکوے، شکایات اور مطالبات ہیں لیکن اللہ کے یہ مومن بندے کہتے ہیں کہ ہم نے جو کچھ لینا ہے اپنے رب سے لینا ہے۔ ان کی یہ بے رغبتی دین پر تربیت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ سچی بات ہے کہ اس کردار کو دعوت

کے میدانوں میں بھی اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم کئی مرتبہ دیکھتے ہیں کہ کسی مسجد و مدرسہ میں دعوت کا کام کرنے کے بہت مواقع موجود ہوتے ہیں لیکن داعی حضرات کو کسی اور مسجد و مدرسہ سے تھوڑا سا مفاد زیادہ مل جائے تو وہ یہ جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ چلے جاتے ہیں۔ یہ رویہ صبر والا نہیں ہے۔ ہمیں سب سے زیادہ فکر اس بات کی ہونی چاہیے کہ ہمارا تقویٰ کمزور نہ ہو جائے اور ہمارے صبر پر زد نہ پڑے۔

قرآن مجید نے یوسف علیہ السلام کا واقعہ بیان کر کے امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ صبر اور تقویٰ سے کام لینے والوں کی محنتوں کو ضرور بارآور کرتا اور انھیں بہتر نتیجے عطا کرتا ہے۔ آج اگر ہم بڑی بڑی تنظیموں اور جماعتوں کی موجودگی کے باوجود اسلامی انقلاب کے مرحلوں تک نہیں پہنچ رہے، ہر طرف الحاد، لادینیت وسیکولرازم پھیل رہا ہے اور بے حیائی و بدکرداری دن بدن بڑھتی جا رہی ہے تو اس کی وجہ انھی دو چیزوں صبر اور تقویٰ کی کمی ہے۔ دعوت اور سیاست کے ذریعے افراد کی تربیت کرتے وقت ان چیزوں پر لوگوں کو پختہ کیا جائے۔ ان کے ذہنوں میں یہ بات راسخ کی جائے کہ فوری نتیجہ طلب نہیں کرنا بلکہ اللہ کے احکامات پر عمل کرتے چلے جانا ہے، وہ جب چاہے گا نتیجے عطا فرمائے گا۔ ایمان اسی چیز کا نام ہے کہ دنیا میں نتیجہ نہیں ملے گا تو آخرت میں مل جائے گا۔ کتنے نبی دنیا میں آئے جنھوں نے سینکڑوں سال دعوت کا کام کیا لیکن ان کی محنت کے نتیجے میں محض چند لوگ ہی مسلمان ہو سکے۔ نوح علیہ السلام کی مثال ہمارے سامنے ہے، ساڑھے نو سو سال دعوت و تبلیغ کے بعد تھوڑی تعداد میں بندوں نے اسلام قبول کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴾ [ھود: ٤٠] ”اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے۔“ اس لیے دین کا کام کرتے وقت صبر بہت ضروری ہے۔

سیدنا حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((يَكُوْنُ بَعْدِيْ أَئِمَّةٌ لَا يَهْتَدُوْنَ بِهُدَايَ، وَلَا يَسْتَنُّوْنَ بِسُنَّتِيْ، وَسَيَقُوْمُ فِيْهِمْ رِجَالٌ قُلُوْبُهُمْ قُلُوْبُ الشَّيَاطِيْنِ فِيْ جُثْمَانِ إِنْسٍ. قَالَ: قُلْتُ: كَيْفَ أَصْنَعُ يَا رَسُوْلَ اللهِ إِنْ أَدْرَكْتُ ذٰلِكَ؟ قَالَ: تَسْمَعُ وَتُطِيْعُ لِلْأَمِيْرِ، وَإِنْ ضُرِبَ ظَهْرُكَ، وَأُخِذَ مَالُكَ، فَاسْمَعْ وَأَطِعْ)) [صحيح مسلم، كتاب الإمارة، باب الأمر بلزوم الجماعة ... : ٥٢/١٨٤٧] ”میرے بعد ایسے امام (حکمران اور رہنما) ہوں گے جو زندگی گزارنے کے میرے طریقے پر نہیں چلیں گے اور میری سنت کو نہیں اپنائیں گے، جلد ہی ان میں ایسے لوگ کھڑے ہوں گے جن کی وضع قطع انسانی ہو گی، دل شیطانوں کے دل ہوں گے۔“ (حذیفہ رضی اللہ عنہ نے) کہا: میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! اگر میں وہ زمانہ پاؤں (تو کیا کروں؟) آپ نے فرمایا: ”امیر اور حکمران کا حکم سننا اور اس کی اطاعت کرنا، چاہے تمھاری پیٹھ پر کوڑے مارے جائیں اور تمھارا مال چھین لیا جائے، پھر بھی سننا اور اطاعت کرنا۔“ حقیقت ہے کہ آج اس صبر کی بہت زیادہ کمی ہے۔ اس کمی کو وہی جماعت پورا

قَالُوۡا تَاللّٰهِ لَقَدۡ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيۡنَا وَ اِنۡ كُنَّا لَخٰطِـِٕيۡنَ ﴿۹۱﴾ قَالَ لَا تَثۡرِيۡبَ عَلَيۡكُمُ

انھوں نے کہا اللہ کی قسم! یقیناً اللہ نے آپ کو ہم پر فضیلت بخشی ہے اور بے شک ہم ہی خطا کار تھے ﴿۹۱﴾ (یوسف علیہ السلام نے)

کرے گی جس کے افراد کی تربیت صبر اور تقویٰ پر ہو گی۔ مجموعی طور پر بکھرے ہوئے لوگ تو ہر جگہ مل جاتے ہیں لیکن ایک جماعت کا صبر اور تقویٰ پر مضبوط رہنا بہت ضروری ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کامیابیاں عطا کرتے ہیں اور اگر کہیں جماعت کی شکل موجود نہ ہو تو پھر بھی مایوسی کی ضرورت نہیں، جیسا کہ ابن مسعود رحمہ اللہ نے فرمایا: ((اَلْجَمَاعَةُ مَا وَافَقَ الْحَقَّ وَإِنْ كُنْتَ وَحْدَكَ)) [تاریخ دمشق : ۴۶/ ۴۰۹] ”جماعت سے مراد وہ ہے جو حق کے مطابق ہو اگرچہ تو ایک ہی شخص (حق پر) ہو۔“ اللہ رب العالمین ایک نیک اور مخلص شخص سے، جس میں صبر اور احسان ہو، ایک پوری جماعت کا کام لے سکتا ہے، فرمایا: ﴿ اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ كَانَ اُمَّةً ﴾ [النحل : ۱۲۰] ”بے شک ابراہیم (علیہ السلام) ایک امت تھے۔“ نعیم بن حماد رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے: ((إِذَا فَسَدَتِ الْجَمَاعَةُ فَعَلَيْكَ بِمَا كَانَتْ عَلَيْهِ الْجَمَاعَةُ قَبْلَ أَنْ يَفْسُدُوْا وَإِنْ كُنْتَ وَحْدَكَ، فَإِنَّكَ أَنْتَ الْجَمَاعَةُ حِيْنَئِذٍ)) [المدخل للبیھقی : ۹۱۰] ”جب جماعت خراب ہو جائے تو تم نے اس منہج پر قائم رہنا ہے جس پر جماعت خراب ہونے سے پہلے تھی، اگرچہ تم اکیلے ہی ہو، کیونکہ اس وقت تم ہی جماعت ہو گے۔“

اللہ رب العالمین کا وعدہ ہے کہ وہ محسنین کے اجر کو کسی صورت ضائع نہیں کرتا۔ ایک فرد کو بھی محسن ہونا چاہیے اور مسلمانوں کی پوری جماعت کو بھی محسنین کی جماعت ہونا چاہیے۔ ایسے ہی لوگوں کی دعوت، خدمت، سیاست اور جہاد کا کام اللہ کے ہاں مقبول ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کی مدد کر کے دنیا و آخرت میں کامیابیوں سے نوازتا ہے۔ یوسف علیہ السلام نے بندے کے محسن بننے کے لیے صبر اور تقویٰ دو چیزیں اختیار کرنے کی بات کی ہے تو اس کے پیچھے ان کی پوری زندگی اور ان کا شاندار کردار ہے۔ ان دو لفظوں میں انھوں نے پوری دعوت کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ بندوں کا کام صبر اور تقویٰ اختیار کرنا ہے، اجر رب تعالیٰ نے عطا کرنا ہے۔ وہ کسی بھی شخص کی طرف سے کی گئی نیکی کو کسی صورت ضائع نہیں کرتا بلکہ ہر نیکی کی قدر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک ایک عمل کا اجر کئی گنا بڑھا دیتا ہے اور کبھی کسی کو بے حساب اجر دیتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوۡنَ اَجۡرَهُمۡ بِغَيۡرِ حِسَابٍ ﴾ [الزمر : ۱۰] ”بے شک صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بغیر حساب دیا جائے گا۔“

آیت 92،91 ﴿ قَالُوۡا تَاللّٰهِ لَقَدۡ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيۡنَا . . . ﴾: برادرانِ یوسف پر جب سارا راز کھل گیا تو انھیں وہ نقشہ یاد آ گیا کہ کس طرح انھوں نے یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینک دیا تھا، لیکن اب وہی یوسف مصر کے تخت پر بیٹھا ہے، تو کہنے لگے کہ اللہ کی قسم! بے شک اللہ رب العالمین نے آپ کو ہم پر فضیلت اور برتری عطا کی ہے۔ ہم عمر میں بڑے

الْيَوْمَ ۖ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۖ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۹۲﴾

کہا آج تم پر کوئی ملامت نہیں، اللہ تمھیں معاف کرے اور وہ سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے ﴿92﴾

اور تعداد میں زیادہ ضرور ہیں لیکن مقام و مرتبہ آپ کا بڑا ہے۔ یہ ساری عزتیں، اعزاز و اکرام اور انعامات اللہ رب العالمین کی طرف سے ہیں اور اب ہمیں یقین آ گیا ہے کہ اسی ذاتِ باری تعالیٰ نے آپ کو اس مقام پر پہنچایا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ کہتے ہیں: ﴿اِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ﴾ ”بے شک ہم ہی خطا کار تھے۔“ ہم نے آپ کے ساتھ یہ سلوک کر کے بہت بڑا ظلم اور گناہ کیا ہے۔

قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ . . . : برادرانِ یوسف نے غلطی کا اقرار کیا تو یوسف علیہ السلام کہتے ہیں کہ آج تم پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ میں نے تمھیں معاف کر دیا ہے۔ میری طرف سے تم کبھی کوئی شکوہ و شکایت نہیں سنو گے۔ میں تمھیں کبھی موردِ الزام ٹھہرا کر ذلیل و رسوا نہیں کروں گا۔ میں نے تم سے کسی قسم کا کوئی بدلہ نہیں لینا۔ یوسف علیہ السلام کا ایک ایک جملہ امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تربیت ہے۔ وہ خود معاف کرنے کے بعد کہہ رہے ہیں: ﴿يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۖ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ﴾ ”اللہ تمھیں معاف کرے اور وہ سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔“ اس کی شفقتیں اور رحمتیں بہت وسیع ہیں۔ آپ اندازہ کیجیے کہ بظاہر اتنا بڑا واقعہ ہے جس میں ظلم کی انتہا ہوئی ہے لیکن یوسف علیہ السلام کا اندازِ گفتگو کس قدر عمدہ ہے۔ ان کے پاس اقتدار ہے، وہ جو چاہیں فیصلہ کر سکتے ہیں، بھائیوں کو سخت سے سخت سزا دے سکتے ہیں اور پھر بھائیوں نے ابھی معافی بھی نہیں مانگی صرف اتنا کہا ہے کہ ہم سے خطا ہوئی ہے، یعنی اپنی غلطی تسلیم کی ہے، لیکن یوسف علیہ السلام خود بخود معافی دے رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ میری طرف سے تم آج کوئی ملامت محسوس کرو گے اور نہ ہی بعد میں تمھیں کسی قسم کا کوئی انتقامی رویہ دکھائی دے گا۔ ایک مسلمان اور مسلم جماعت کا انداز ہمیشہ یہی ہونا چاہیے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی مکہ میں کس قدر ظلم وستم ڈھائے گئے، آپ شعب ابی طالب میں بند رہے۔ آپ کو مجبور ہو کر مکہ سے ہجرت کرنا پڑی اور پھر مدینہ ہجرت کر جانے کے بعد بھی مشرکین نے پیچھا نہیں چھوڑا اور قبائل کو جمع کر کے مدینہ پر حملہ آور ہوتے رہے، لیکن جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کر لیا تو یہ سارے کافر اور مشرک رشتہ داریاں جتلا کر ہاتھ جوڑ کر معافیاں مانگ رہے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کی چوکھٹ پر کھڑے تھے، جب آپ نے سوال کیا کہ بتاؤ آج میں تمھارے ساتھ کیا سلوک کروں تو وہ کہہ رہے تھے کہ ہم آپ سے اچھے سلوک کی توقع رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آپ عزت والے شخص ہیں اور عزت دار گھرانے اور ہمارے رشتہ داروں میں سے ہیں۔ اس موقع پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی الفاظ دہرائے جو یوسف علیہ السلام نے کہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ ”آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں ہے۔“ میں نے تمھیں معاف فرما دیا ہے اور میں نے تمھیں کوئی سزا نہیں دینی۔

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۳﴾ ع

میری یہ قمیص لے جاؤ، پس اسے میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو، ان کی نظر واپس آجائے گی اور تم اپنے تمام اہل و عیال سمیت میرے پاس آجاؤ ﴿93﴾

[شرح معاني الآثار ۳/ ۳۲۵، ح: ۵٤٥٤]

انبیائے کرام علیہم السلام کی سیرت سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو بلند مقام پر پہنچا دے تو پھر دل میں تکبر نہیں آنا چاہیے۔ بعض لوگوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ انھیں کوئی بڑا عہدہ مل جائے یا ان میں سے کوئی اقتدار میں آجائے تو وہ اپنے رشتہ داروں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور انھیں مقدمات میں الجھا کر جیلوں میں قید کرواتے رہتے ہیں۔ ایک طرف کچھ لوگوں کا یہ رویہ ہوتا ہے تو دوسری جانب اللہ کے مخلص بندوں کو جب عزت وحکومت ملتی ہے تو ان کے دلوں میں تکبر کی بجائے عاجزی وانکساری ہوتی ہے اور ان میں عفو و درگزر بڑھ جاتا ہے۔ نبی علیہ السلام کو ملنے والے اقتدار اور حکومت کی مثال پیش کر کے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی تربیت کر رہے ہیں کہ جب انھیں اس نعمت سے نوازا جائے تو انھیں لوگوں کے ساتھ احسان پر مبنی سلوک کرنا اور ذاتی انتقام کی بجائے عفو و درگزر سے کام لینا ہے، البتہ اگر دین کا مسئلہ یا ارتداد کا معاملہ ہو تو اس کی رب تعالیٰ نے بہت سخت سزا رکھی ہے۔ اللہ کے حق میں جو سزا واجب ہو جائے اس سے کسی صورت انحراف نہیں کرنا اور اسے حسبِ استطاعت شرعی قواعد کے مطابق لاگو کرنا ہے۔ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے۔

یوسف علیہ السلام کہتے ہیں کہ آج کے بعد تمھیں کوئی ملامت نہیں ہو گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میری طرف سے کبھی اس بات کا ذکر بھی نہیں کیا جائے گا کہ تم نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا اور میں کبھی کوئی ایسی بات نہیں کروں گا جس سے تمھارے دلوں میں تنگی محسوس ہو۔ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی تمھیں معاف فرمائے گا۔ اصل معافی تو اسی پاک پروردگار کی ہے۔ یہ بھائیوں کے لیے دعوت ہے کہ تم رب تعالیٰ سے معافی مانگو۔ یہ یوسف علیہ السلام کی عظمت اور اعلیٰ اخلاق کا ثبوت ہے کہ وہ نہ صرف خود معاف کر رہے ہیں بلکہ اللہ رب العالمین سے بھی ان کے لیے بخشش طلب کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ وہ ضرور معاف فرما دے گا۔ والدین کو اپنی اولاد سے بڑی محبت ہوتی ہے۔ بھائی اپنے بھائی سے اور دوست ایک دوسرے سے بڑی محبت اور شفقت رکھتے ہیں، لیکن اللہ رب العالمین کی شفقت اور محبت سب پر حاوی ہے۔ کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہ بہت زیادہ رحم کرنے اور معاف فرمانے والا ہے۔